بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس طرح ایک بیج کے نشو و نما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھی پڑتی بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے اُسی طرح کلمۂ حق کی دعوت میں مجرد حق کی فطری صلاحیتوں ہی پر اعتماد نہیں کر لینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق پیش کیا جا رہا ہے، دعوت کے وقت نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی حالت کیا ہے؟ زمینوں کی طرح روحوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اور ایک داعی کا فرض ہے کہ ان موسموں سے اسی طرح واقف ہو جس طرح ایک دہقان زمین کی فصلوں اور موسموں کو پہچانتا ہے اور اسی وقت کوئی بیج ڈالے جب موسم سازگار ہو۔ جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، خواہ اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ حق اپنے ذاتی جوہر اور اپنی فطری کشش سے خود بخود دلوں میں جگہ پیدا کرے گا، اس کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی اس غلطی کی سزا اپنی دعوت کی ناکامی کی شکل میں پاتے ہیں اور ان کی نیک نیتی ان کی اس بے تدبیری اور غفلت کے نتائج سے ان کو بچا نہیں سکتی جو مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے باب میں ان سے صادر ہوتی ہے۔

ایک داعی کو جن مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سے ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر جتنے مختلف نوعیت کے معاملے اس کو کرنے پڑتے ہیں ان سب کی تفصیل نہ ممکن ہے اور نہ اس کے لیے یہاں گنجائش ہے لیکن حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طرز عمل سے یا ان ہدایات سے، جو ان کو اس بارہ میں دی گئی ہیں، بعض اصولی باتیں مستنبط ہوتی ہیں جو بطور مثال ہم یہاں بیان کر دیتے ہیں تاکہ ان کو

پیشِ نظر رکھکر ہمارے ارکان، مختلف حالات کے لحاظ سے اپنے لیے طرزِ عمل خود متعین کرسکیں۔ اس چیز کا تعلق درحقیقت عام فہم سے ہے۔ ایک سلیم الطبع اور نیک نیت داعی، جو اپنے مقصد کو اچھی طرح پہچانتا ہے، اگر ان مثالوں کو پیشِ نظر رکھے گا تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنے طریقِ دعوت کو انبیاء کے طریقِ دعوت سے مشابہ بنانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ یہاں ہم جن اصولی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ ذیل ہیں

۱۔ ایک چیز کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ بعض اعتبار سے وہ سہل و آسان ہوتی ہے بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ کسی مبتدی کے سامنے اگر اس کو اس پہلو سے پیش کیجیے جو سہل ہے تو اس کو اس سے کچھ ایسی اجنبیت اور نفرت نہیں ہوگی، لیکن اگر، پہلی ہی ملاقات میں، اس کو دوسرے پہلو سے پیش کردیجیے تو وہ فوراً اس سے وحشت زدہ ہوکر بھاگ کھڑا ہوگا اور پھر شاید کبھی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ دینِ حق کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بیگانہ سے بیگانہ آدمی کے لیے بھی وہ اپنے بعض پہلوؤں سے دل آویز اور دل کش ہے اور اگر اسی پہلو سے اس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہوکر اس کے نرم و سخت سب کو قبول کرلیتا ہے لیکن مانوس سے مانوس آدمی بھی اس کے بعض پہلوؤں کو سخت اور گراں محسوس کرتا ہے اور اگر اس کے سامنے اس پہلو سے اس کو پیش کیا جائے تو مزید مانوس ہونا تو الگ رہا اندیشہ اس بات کا رہتا ہے کہ اس کا سابق انس بھی وحشت و اجنبیت سے بدل جائے۔ جو لوگ ایک شے کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فرق کو نہیں جانتے یا اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک مبتدی کے سامنے ایک شے کا کونسا پہلو سب سے پہلے لانا چاہیے یا طبعاً ان کا مذاق ہی اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ زمینوں ہی میں طبع آزمائی کرتے اور ہر بات میں تشدد ہی کو کمالِ دینداری خیال کرتے ہیں، وہ لوگ جب دعوتِ دین کا کام سنبھالتے ہیں تو ان کی دعوت کا نتیجہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ لوگ قریب آنے کے بجائے اور دور ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ لوگ دعوت کے لیے جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ انسانی نفسیات کے لحاظ سے بالکل الٹی ہوتی ہے، اور اس سے بشارت کی جگہ

نفرت اور انس کی جگہ بیزاری پھیلتی ہے۔ اسی چیز سے روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بشروا ولا تنفروا (خوش خبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ) اور داعیان حق کے لیے صحیح طرز عمل یہ بتایا کہ انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو)

۲۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز ایک داعی کے لیے قابل لحاظ ہے کہ اسے کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیت جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ ہر داعی حق کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قوم اپنے معتقدات اور روایات کے ساتھ کم و بیش اسی طرح کی وابستگی رکھتی ہے جس طرح کی وابستگی ایک داعی حق اپنے معتقدات کے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ وابستگی اگر باطل ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جن کی وجہ سے یہ غلط وابستگی قائم ہے اور ان کی اصلاح کو اس وابستگی کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ حق پرستی کے جوش یا باطل کی مخالفت کے جذبے سے مغلوب ہو کر یہ ہرگز نہ کیا جائے کہ اس غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کے بجائے خود اس پر براہ راست حملہ کر دیا جائے۔ اس طرح کے براہ راست حملہ کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے (اور یہی ہو سکتا ہے) کہ مخاطب حمیت جاہلیت کے جوش سے بے خود ہو کر دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس جوش میں وہ ایسا اندھا بہرا ہو جاتا ہے کہ جو اینٹ پتھر اسے سامنے مل جاتا ہے وہی اٹھا کر وہ داعی پر پھینک مارتا ہے۔ سورہ انعام میں داعیان حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ

اور تم نہ گالی دو ان کو جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ حد سے گذر کر بے جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں، یونہی ہم نے ہر امت کی نظروں میں اس کے اعمال کھبا دیے ہیں

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک ہدایت قرآن مجید نے یہ بھی دی ہے کہ دعوت حق کے کام کے سلسلے میں ساری گفتگو اصل مقصد تک محدود رہنی چاہیے اور اگر مخاطب کی طرف سے کوئی ایسا پہلو چھیڑ دیا جائے

جس سے دونوں فریق کے مقتداؤں اور لیڈروں میں ترجیح و تفضیل کا معرکہ کارزار گرم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو داعیان حق کو چاہیے کہ بحث کی غلط رو میں بہ جانے کے بجائے اس کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں کی تحقیر کے بجائے ان کے لیے اس عزت و احترام کا اعتراف کریں جس کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ	اور میرے بندوں سے کہو وہ بات کہیں جو بہتر ہے۔
اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ	شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ بے شک
كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ	شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تمھارا رب تم کو خوب جانتا ہے
بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ	اگر چاہے گا تم پر رحم کرے گا اور اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۔ وَرَبُّكَ	اور ہم نے تم کو ان کے ایمان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔
اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ	اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں
فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا	اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے
دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۵۳-۵۵ بنی اسرائیل)	داؤد کو زبور دی ہے۔

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعی حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عصبیت جاہلیت کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈال دینے والی ہوں۔

۴- جو لوگ عزت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز رہنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اپنے لیے خطاب و کلام میں تعظیم و تکریم کے خوگر ہو چکے ہوں اور اندیشہ ہو کہ اس کی خلاف ورزی سے ان کے پندار نفس کا شیطان جاگ اٹھے گا اور ان کو حق بات سننے سے روک دے گا، داعی حق کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک ان کی اس بیماری کا لحاظ رکھے تاکہ قبول حق میں ان کے اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ	فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے

قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۴۴-طٰہٰ) نرمی سے بات کرو تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔ لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے تو پھر یہ چیز جائز نہیں ہے۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

۴۔ جس طرح ایک ماہر طبیب مریض کی عمر، اس کے مزاج اور مرض کی شدت و خفت کے لحاظ سے اس کے لیے دوا کی خوراک تجویز کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کا بھی فرض ہے کہ وہ مخاطب کی استعداد طلب اور ظرف کے لحاظ سے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ اس چیز کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے صرف مخاطب کی نوعی استعداد اور قابلیتوں ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کی قومی خصوصیات اور اس کے انفرادی حالات کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر کسی دعوت کی کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے قرآن مجید مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ وقرآنا فرقناہ لتقرأہ على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا (اور ہم نے قرآن کو مختلف وقتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا تاکہ تو لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کے پیش کرے اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ اتارا)۔ اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں عربوں کے افتاد مزاج کے لحاظ سے اختیار کی گئیں۔ مثلاً چونکہ وہ ضدی اور جھگڑالو (قوماً لدّا) تھے اس وجہ سے ان سے بحث و مناظرہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو ایک جھگڑالو اور ضدی قوم کے لیے موزوں تھا۔ نیز آنحضرت صلعم دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دین کو جس انداز سے پیش کرتے تھے وہ اس سے بالکل مختلف تھا جس انداز سے آپ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ طریق دعوت کا یہ فرق محض ان جماعتوں کی نفسیات کے اختلاف کی بنا پر تھا جن کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں ان کے سامنے دین کی سیدھی سادی تعلیمات پیش کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان پر عمل کریں۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ

لگاتار دعوت دی جاتی تھی۔

۵۔ جس طرح ایک دہقان کے لیے زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کے بغیر بیج ڈالنا جائز نہیں ہے اور ایک طبیب مرض کے بحران کی حالت میں مریض کو دوا دینے سے احتراز کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کو ان تمام اوقات میں دعوت سے احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی پر مستعد ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس حالت میں دعوت پیش کرنے سے احتراز ضروری ہے بلکہ اگر دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض و نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ بحث کو بڑھانے کے بجائے اس کو وہیں ختم کر کے وہاں سے علیحدہ ہو جائے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرے جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے شوق سے محفوظ ہو۔

اذا رأیت الذین یخوضون فی ایٰتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین (۶۸-۶)

جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو

اس صریح ہدایت کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغ دین کے لیے مناظرے کے طریقہ کو کیسے جائز سمجھا جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس مقصد سے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی بات کی تردید و تکذیب کریں گے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو مناظرہ کی مجالس کا کچھ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان مجالس سے صرف اس "خوض" کے شوق کو شہ ملتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اس کی بو محسوس کرتے ہی داعی حق کو مجلس سے دامن جھاڑ کے اٹھ جانا چاہیے۔ لیکن ہمارے مناظرین کو یہ بو اس قدر مرغوب رہی ہے کہ جس قدر یہ بڑھی اسی قدر ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔

۶۔ اسی طرح ان مواقع سے بھی داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو

کہ دعوت حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گذرے۔ اگرچہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم مستعدی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن عکرمۃ ان ابن عباس قال حدث الناس کل جمعۃ مرۃ فان ابیت فمرتین فان اکثرت فثلاث ولا تمل الناس هٰذا القراٰن ولا الفینک تاتی القوم وهم فی حدیث من حدیثهم فتقص علیهم فتملهم ولکن انصت فاذا امروک فحدثهم وهم یشتهونه	عکرمہ سے روایت ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ کیا کرو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دو بار۔ اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار۔ اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس ایسے وقت میں آؤ جب وہ اپنی کسی اور دلچسپی میں ہوں اور اس وقت ان کو وعظ سنانا شروع کر دو اور نتیجہ اس کا بیزاری ہو۔ ایسے مواقع پر خاموش رہو۔ یہاں تک کہ لوگ تم سے خواہش کریں تو ان کو سناؤ تاکہ تمہارا وعظ وہ رغبت سے سنیں۔

۷۔ داعی حق کے لیے اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی خشکی و یکرنگی، اس کی بے ضرورت تکرار، اور اس کے بے فائدہ طول بیان سے سننے والے اس سے بدحظ اور بیزار نہ ہونے پائیں۔

عن شقیق قال کان عبد الله بن مسعود یذکر الناس فی کل خمیس فقال له رجل یا ابا عبد الرحمٰن لوددت انک ذکرتنا فی کل یوم قال اما انه یمنعنی من ذلک انی اکره ان املکم وانی اتخولکم بالموعظة کما کان رسول الله صلی الله علیه وسلم	شقیق سے روایت ہے کہ عبد الرحمٰن بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن (عبداللہ بن مسعود کی کنیت ہے) میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ایسا صرف اس خیال سے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمھیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح

یتخولنا بہا مخافۃ السآمۃ علینا (متفق علیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ناغہ کرکے نصیحت کیا کرتے تھے تاکہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔

یہ سطریں لکھتے وقت ہمارے سامنے ان واعظین اور ان کے بدقسمت اور مظلوم سامعین کی ایک تصویر آگئی ہے جن کی وعظ گوئی کا سب سے بڑا ہنر ان کا لامعنی طول کلام ہے اور جو اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ بہتر سے بہتر بات بھی بے ضرورت بار بار دہرانے سے ناگوار بنجایا کرتی ہے اور وعظ سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑجانے سے نہ صرف یہ کہ دعوت دین کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ الٹے اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ بدحظ نہ ہونے پائیں۔ آپ کے خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے۔ اور روایات میں آتا ہے کہ آپ کی ہدایت تھی کہ "جب نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرو"۔ اور بعض روایات میں خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانشمندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض خطبے جادو ہوتے ہیں"۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خطبے مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہئیں کہ جادو کی طرح دلوں پر اثر کریں نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کردیں کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہ جائے۔

۸۔ ایک داعی حق کو اپنے گرد و پیش کا پوری ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے کب کوئی موزوں موقع ہاتھ آتا ہے اور جوں ہی وہ محسوس کرے کہ اس مقصد کے لیے کوئی موقع پیدا ہو گیا ہے بغیر کسی توقف کے اسے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ملتی ہے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۚ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ

اور اس کے ساتھ دو نوجوان قیدخانہ میں داخل ہوئے ایک نے کہا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں

مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ
تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ
يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ
مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ كٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ
بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا
وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ
خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ
مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ
خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ
مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ
تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ (۳۶ - ۴۱ یوسف)

کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ آپ نہایت بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یوسف نے کہا جو کھانا تمھیں ملتا ہے اس کے ملنے سے پہلے میں اس کی تعبیر تمھیں بتا دوں گا۔ یہ ان باتوں میں سے ہے جس کی تعلیم مجھے میرے رب نے دی ہے۔ میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی تھی اور وہ آخرت کی بھی منکر تھی، اور میں نے پیروی کی اپنے باپ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کی۔ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھیرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر فضل ہے لیکن اکثر لوگ اس کی شکرگزاری نہیں کرتے۔ اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! کیا بہت سے رب بنانا بہتر ہے یا ایک اللہ واحد قہار کو؟ اس کے سوا نہیں تم پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، جن کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کا اختیار نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا۔ باقی رہا دوسرا تو اس کو سولی ہوگی اور چڑیاں اس کے سر کو نوچیں گی۔ تو اس بات کا فیصلہ ہو گیا جس کو تم دریافت کر رہے تھے۔

اس پر ایک نظر ڈال کر واقعہ کی پوری تصویر چشم تصور کے سامنے لائیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو آدمی جیل میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا شوق

ہوتا ہے۔ قید خانہ کے آدمیوں میں ہر اعتبار سے صرف حضرت یوسف علیہ السلام ایسے آدمی ان کو نظر آئے جن کی طرف اس غرض کے لیے وہ رجوع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حسن عقیدت و احترام کے جذبے کے ساتھ اپنے خواب ان کے سامنے پیش کیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس موقع پر یہ نہیں کرتے کہ انھیں خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دیں یا ان کے جذبۂ عقیدت سے فائدہ اٹھا کر ان پر اپنی شخصیت و بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں اور اس سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہیں بلکہ وہ ان کے اس التفات کو غنیمت سمجھ کر وہ دعوت ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ان کے دل سے لگی ہوتی ہے۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

اور پیش کرنے کا انداز ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ سخن میں بات میں بات پیدا ہو گئی ہے نہ کہ قصداً کر کے ایک بات کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اہم حقیقت تو یہ سامنے آئی کہ جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے لیے گھات لگائے بارش کا انتظار کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنی چاہیے کہ کب کسی دل میں اس کے لیے وہ التفات پیدا ہوتا ہے جو اس کی دعوت کی تخم ریزی کے لیے فصل و موسم کا کام دے سکتا ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کوئی اس طرح کا موقع میسر آجائے تو نہ تو اس کو ضائع کرنا جائز ہے اور نہ اس اعلیٰ مقصد کے سوا کسی اور غرض کے لیے اس کو استعمال کرنا جائز ہے۔ اس طرح کے مواقع جب خود غرض لوگوں کو ملتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان کو دعوت حق کے لیے استعمال کریں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر ہمارے علماء و مشائخ اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جب اپنی طرف کسی دل کو ملتفت پاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان کی خوشی اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح کی خوشی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کے التفات سے ہوئی تھی بلکہ یہ خوشی اس مکڑی کی خوشی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اردگرد جالا تن کر مکھیوں کے انتظار میں بیٹھتی ہے اور جب کسی مکھی کو پاس آتے دیکھتی ہے تو جوش نشاط سے ناچنے لگتی ہے کہ ایک

فربہ شکار ہاتھ آیا۔

۹۔ ہر داعی حق کے لیے بحث و استدلال میں مخاطب کے درجہ اور حیثیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً اہل علم سے جو خطاب ہوگا اور جس انداز اور جس لب و لہجہ میں ہوگا وہ اس انداز اور لب و لہجے سے مختلف ہوگا جو عوام کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ ایک داعی حق کے لیے محض اس بنیاد پر کہ پوری سچائی صرف اسی کے ساتھ ہے، یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ دوسری تمام جماعتوں کو جن کے پاس پوری سچائی نہیں ہے، ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے بلکہ اس کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھیک تول کر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ان کی جگھوں پر رکھے اور ہر ایک کی حیثیت کا لحاظ کر کے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ مثلاً اہل کتاب کے سامنے دعوت پیش کرنے کے متعلق قرآن مجید نے یہ ہدایت فرمائی ہے:۔

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي	اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہے
هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا	مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو ہم ایمان لائے
آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ	اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس چیز پر
وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ	جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے اور ہمارا معبود اور تمھارا
(۴۶۔ عنکبوت)	معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہاں جس احسن طریقہ سے اہل کتاب سے مباحثہ کرنے کی اجازت دی ہے اس کی صورت بھی بیان کر دی ہے کہ وہ جن پہلوؤں سے تمھارے ہم رتبہ ہیں یا جو امور ان کے اور تمھارے درمیان مشترک ہیں ان کا اقرار کرو تا کہ ان کے اور تمھارے درمیان نفرت کے بجائے موانست اور دوری کے بجائے قرب پیدا ہو اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمات سے جو باتیں لازم آتی ہیں اس میں بھی وہ تمھارے ساتھ متفق ہو جائیں۔ اس طریق دعوت کا نفسیاتی اثر مخاطب پر یہ ہوگا کہ وہ یہ خیال کرے کہ داعی نہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہے اور نہ اپنی دعوت کو کسی نئے اکتشاف کی حیثیت سے

پیش کر رہا ہے بلکہ اس دعوت میں جتنا حصہ مخاطب کا ہے اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہا ہے، وہ اس پر غور کرنے کی طرف مائل ہوگا اور اگر کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم نہ ہوگا تو اس کو قبول بھی کرے گا۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے بلکہ اہل علم اور اہل کتاب کو بھی اسی طرح خطاب کیا جائے جس طرح امیوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کا پندار مجروح ہوگا جو داعی ہی کی طرح علم اور کتاب کے مدعی ہیں اور یہ چیز قبول دعوت کی راہ میں شدید مزاحمت پیدا کرے گی۔

۱۰۔ داعی حق اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی کی بو محسوس کرے تو اپنی طرف سے ہرگز اس بات کا موقع نہ دے کہ اس کا یہ ذوق ابھرے بلکہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے یہاں تک کہ اگر وہ داعی کی کسی دلیل پر ایسا معارضہ کر بیٹھے جو بالکل کھلی ہوئی دھاندلی ہو جب بھی اس دلیل کے پیچھے پڑنے اور اس پر ردوکد کے بجائے اس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے سامنے امر حق کسی ایسے پہلو سے پیش کیا جائے جس پر اس کو اپنی ہٹ دھرمی کے اظہار کا موقع نہ ملے بلکہ اگر اس میں قبول حق کی صلاحیت ہو تو اس کو قبول کرے اور اگر نرا معاند ہی ہو تو کم از کم ہکا بکا ہو کے رہ جائے اس کو بحث وجدال کا کوئی موقع نہ ملے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے جو اس کی بہترین مثال ہے:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (۲۵۸۔ بقرہ)	کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس وجہ سے جھگڑا کیا کہ اللہ نے اس کو اقتدار بخشا، جبکہ ابراہیم نے اس سے کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس نے کہا میں مارتا ہوں اور میں زندہ کرتا ہوں، ابراہیم نے کہا اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اس کو پچھم سے نکال تو کافر ہکا بکا ہو کے رہ گیا اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ......

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی تھی وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوئی تھی اور وہ چاہتے تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے لیکن مخاطب کی نفسیات کا اندازہ کر لینے کے بعد اگر وہ اس پر مزید اصرار فرماتے تو یہ چیز اس طریقہ کے بالکل خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے فرمائی ہے کہ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

انگریزی زبان میں ایک مذہبی رسالہ کا اجراء

شہور شرین نومسلم محمد اسد صاحب جو زمانہ جنگ میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اب الحمد للہ قید فرنگ سے آزاد ہو کر پھر اپنے علمی و مذہبی کاموں میں مشغول ہو رہے ہیں۔ موصوف گرفتاری سے پہلے صحیح بخاری کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے جس کے کچھ پارے چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی ایک کتاب Islam at the Crossroads علمی و مذہبی حلقوں میں کافی شہرت پا چکی ہے۔ جو لوگ ان کتابوں سے واقف ہیں وہ موصوف کے طرز فکر اور انداز بحث سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اب ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی ہے کہ موصوف ماہ اگست ۱۹۴۶ء سے ڈلہوزی سے، انگریزی زبان میں عرفات نامی ایک پرچہ نکال رہے ہیں جس کا اشتہار ان صفحات میں کہیں دیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ان توقعات کے بالکل مطابق ہوگا جو مصنف سے علمی و مذہبی حلقوں میں قائم ہو چکی ہیں۔